

پھر اباجی اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے بے کے ساتھ پیس لڑانے میں مشغول ہو گیا۔

اول اول کالج سے میں داؤ جی کے خطوط کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد بے قاعدگی سے لکھنے لگا اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ چھٹیوں میں جب گھر آتا تو جیسے سکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا، ویسے ہی داؤ جی کو بھی سلام کرتا۔ اب وہ بجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کوٹ پتلون اور نائی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چارپائی پر بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ کہا کرتے اگر مجھے اٹھانے نہیں دیتا تو خود کرسی لے لے اور میں کرسی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لا سبریری سے جو کتابیں ساتھ لایا کرتا، انہیں دیکھنے کی تمنا ضرور کرتے اور میرے وعدے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے گھر آ کر کتابیں دیکھ جاتے۔ امی چند بوجوہ کالج چھوڑ کر بینک میں ملازم ہو گیا تھا اور دلی چلا گیا تھا۔ بے بے کی سلائی کا کام بدستور تھا۔ داؤ جی بھی منصفی جاتے تھے لیکن کچھ نہ لاتے تھے۔ بی بی کے خط آتے تھے اور وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ کالج کی ایک سال کی زندگی نے مجھے داؤ جی سے بہت دور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دوسال پہلے ہمارے ساتھ آپوٹاپو کھیلا کرتی تھیں، بنت عم بن گئی تھیں۔ سینکڑا ایسر کے زمانے کی ہر چھٹی میں آپوٹاپو میں گزارنے کی کوشش کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔ گھر کی مختصر مسافت کے سامنے ایک آباد کاطولی سفر زیادہ تکین وہ اور سہانا بن گیا، انہی ایام میں میں نے پہلی مرتبہ ایک خوبصورت گلابی پیدا اور ایسے ہی لفافوں کا ایک پیکٹ خریدا تھا اور ان پر نہ اباجی کو خط لکھے جاسکتے تھے اور نہ ہی داؤ جی کو۔ نہ دہراتے کی چھٹیوں میں داؤ جی سے ملاقات ہو سکی، نہ کرسمس کی تعطیلات میں۔ ایسے ہی گزر گیا اور یوں ہی ایام گزرتے رہے۔

ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ بلوے ہوئے۔ پھر لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں اور اماں نے ہم سب کو گھر بلوالیا۔ ہمارے لیے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ نیئے ساہو کار گھر یا رچھوڑ کر بھاگ رہے تھے لیکن دوسرے لوگ خاموش تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہی لوگ یہ خبرا لائے کہ آزادی مل گئی! ایک دن ہمارے قصبه میں بھی چند گھروں کو آگ

گئی اور دوناکوں پر سخت لڑائی ہوئی۔ تھانے والوں اور ملٹری کے سپاہیوں نے کرفیو گاہ دیا اور جب کرفیو ختم ہوا تو سب ہندو سکھ قصبه چھوڑ کر چل دیئے۔ دوپہر کو اماں نے مجھے داؤ جی کی خبر لینے کو بھیجا تو اس جانی پیچانی گلی میں عجیب و غریب اجنبی صورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر یعنی داؤ جی کے گھر کی ڈیویٹھی میں ایک بیل بندھا تھا اور اس کے پیچھے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے گھر آ کر بتایا کہ داؤ جی اور بے بے اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور اب لوٹ کر نہ آئیں گے۔ داؤ جی ایسے بے وفا نہ تھے!— کوئی تیرے روز غروب آفتاب کے بہت بعد جب میں مسجد میں نئے پناہ گزینوں کے نام نوٹ کر کے اور کمبل بھجوانے کا وعدہ کر کے اس گلی سے گزر اتوکھلے میدان میں سود و سو آدمیوں کی بھیڑ دیکھی۔ مہاجر لڑکے لاٹھیاں پکڑے نفرے لگارہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے تماشا ہیوں کو پھاڑ کر مرکز گھنے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا۔ ”ساتھ کے گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ جب لوتا تو اپنے گھر میں گھٹا چلا گیا۔“

”کون سے گھر میں؟“ بزرگ نے پوچھا۔

”رہتکی مہاجرول کے گھر میں۔“ لڑکے نے کہا۔

”پھر؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”پھر کیا؟ انہوں نے پکڑ لیا۔ دیکھا تو ہندو لٹکا۔“

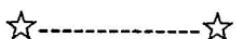
اتنے میں اس بھیڑ سے کسی نے چلا کر کہا۔ ”اوے رانو جلدی آ۔ اوے جلدی آ۔ تیری سامی۔ پنڈت۔ تیری سامی۔“

رانو بکریوں کا ریوڑ بڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔ انہیں روک کر اور ایک لاٹھی والے لڑکے کو ان کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ میں گھس گیا۔ میرے دل کو ایک دھکا سالاگا۔ جیسے انہوں نے داؤ جی کو پکڑ لیا ہو۔ میں نے ملزم کو دیکھے بغیر اپنے قربی لوگوں سے کہا۔ ”یہ بڑا چھا آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی ہے۔ اسے کچھ مت کہو۔ یہ تو۔ یہ تو۔“ خون میں نہائی ہوئی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور ایک نوجوان گندٹا سی قول کر بولا۔

” بتاؤں تھے بھی! — آگیا برا حماستی بن کر۔ تیرے ساتھ کچھ ہوا نہیں

نا۔" اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا۔ "انصار ہو گا شاید۔" میں ڈر کر دوسری جانب بھیڑ میں گھس گیا۔ رانو کی قیادت میں اس کے دوست داؤ جی کو گھیرے کھڑے تھے اور رانو، داؤ جی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ "اب بول بیٹا اب بول۔" اور داؤ جی خاموش کھڑے تھے۔ ایک لڑکے نے ان کی پگڑی اتار کر کہا۔ "پہلے بودی کاٹ بودی۔" اور رانو نے مساویں کاٹنے والی درانتی سے داؤ جی کی بودی کاٹ دی، وہی لڑکا پھر بولا۔ "بلاویں جے؟" اور رانو نے کہا۔ "جانے و بدھا ہے میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا۔" پھر اس نے داؤ جی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کلمہ پڑھ پنڈتا۔" اور داؤ جی آہستہ سے بولے "کونسا؟"

رانو نے ان کے نگے سر پر ایسا تمہرہ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچ اور بولا۔ "سالے کلے بھی کوئی پانچ سات ہیں!" جب وہ کلمہ پڑھ بچے تو رانو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ "چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں۔" اور نگے سر داؤ جی بکریوں کے پیچے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فریدا چل رہا ہو!



گل طریا

سردیوں کی ایک مجدد اور تاریک رات کو بھیانے میرا الحاف اٹھا کر مجھے
بچنچھوڑ اور آہستہ سے کہا۔ ”آٹھو، ٹی ٹی آگیا ہے۔“ گرم گرم لحاف کی گود میں بڑے
آرام سے سویا ہوا تھا اور اس وقت اگر کوئی مجھے اٹھا کر سلیمانی ٹوپی دینے کا وعدہ بھی کرتا
تو میں نہ اٹھتا لیکن ٹی کاتام مُن کر میں چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور کوٹھڑی میں
ادھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ کمرے میں دھونی ہوئی چمنی والی لمورتی لاٹیں جل رہی
تھی اور اس کے پاس بھیا سر جھکائے سحری کھار ہے تھے۔ میں نے پاؤں چارپائی سے
اتارتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں ہے ٹی ٹی؟“ تو انہوں نے اسی طرح سر جھکائے جواب
دیا۔ ”یچے تو اترو، آنکھیں تو کھولو۔ سب کچھ آپ سے آپ نظر آجائے گا۔“

میں نیچے اتر ا۔ آنکھیں کھولیں، دھونی ہوئی چمنی کے آگے ہاتھ کر کے بھیا کو
دیکھا مگر ٹی نظر نہ آیا۔ چارپائی کے نیچے ہم دونوں کا مشترکہ ٹرینک پڑا تھا۔ اس کے پاس
بیٹ اور کٹیں بکھری ہوئی تھیں اور ان سے ذرا فاصلے پر بستر سے گرجانے والی کتابیں اور
کاپیاں اونڈھی سیدھی لیتھیں لیکن ٹی کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ میں نے ایک مرتبہ
پھر ہولے سے پوچھا۔ ”کہاں ہے بھیا؟“ اور بھیا اسی طرح سحری کھاتے رہے۔ انہوں
نے دہی کا کٹورا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لو سحری کھاؤ۔ صبح صبح چکے چکے روزہ رکھ
لینا، کسی کو کانوں کا نخبر نہ ہوگی۔“

بچپن میں ہر چھوٹے بچے کی طرح مجھے بھی روزہ رکھنے کی بڑی تمنا ہوا کرتی
تھی لیکن گھروالے سحری کے وقت جگاتے نہیں تھے۔ بھیا سے کئی مرتبہ درخواست کی
تھی، پر وہ بھی گھروالوں کا ساتھ دیتے رہے۔ ہر صبح میں اٹھتے ہی ان سے خوب جھگڑتا،

گالیاں نہ تا اور بد دعا میں دیتا۔ اب پر بھی وہ برہم نہ ہوتے اور مسکرانے لگتے تو انہیں بجو بجو کہہ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتا لیکن وہ اسی طرح مسکراتے رہتے اور میرا روزہ جوں کا ٹوں رہ جاتا۔

آج انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے اپنے آپ اٹھا دیا تھا اور اپنی سحری پر دعوت دے رہے تھے لیکن ٹیٹی کا نام سن کر سحری کھانے اور روزہ رکھنے میں لطف نہ رہا تھا۔ میری نگاہیں چاروں طرف اسے ڈھونڈ رہی تھیں اور میرا بجی اس سے لپٹ کر پیار کرنے کو چاہتا تھا۔ اگر بھیا سے بار بار پوچھتا تو وہ یقیناً مجھے ستاتے، مجھے اس کے پاس نہ لے جاتے اور وہ رات اسے دیکھے بغیر گزر جاتی۔ میں نے جلدی جلدی سحری کھانا شروع کر دی اور بھیا سے پہلے فارغ ہو گیا۔ پرانہوں سے ہاتھ چکنے ہو گئے تھے۔ وہ میں نے قیص سے پوچھے اور بوئیوں کے ریشے جو دانتوں میں پھنس گئے، انہیں ایسے ہی رہنے دیا۔ بھیا نے بڑے اطمینان سے سحری ختم کی۔ گرم پانی سے ہاتھ دھوئے۔ منج� سے دانت صاف کیے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے مخالصانہ رائے دیتے ہوئے کہا۔ ”ٹیٹی کو دیکھنے چلیں؟“ تودہ ہنس پڑے اور دیر تک کرسی پر آگے پیچھے جھولنے کے بعد بولے۔ ”میں تو یوں نہیں کہہ رہا تھا۔ ایسی اندر ہیری رات میں بھلا کون اسے لاتا اور کس طرح ہمارے یہاں پہنچاتا۔“

یہ بات سُن کر میں جھلا گیا اور مکاتاں کر بولا۔ ”بجو بکواسی، مجھے اٹھایا کیوں تھا پھر؟“ بھیا اسی طرح جھولتے رہے۔ میں ان کی اس حرکت پر باوے لے کتے کی طرح جھپٹنا اور انہیں گردن سے پکڑ کر جھپٹکے دینے لگا۔ وہ بہتے رہے اور اپنا آپ چھڑاتے رہے۔ میں نے ان کے بال پکڑ کر سر کو زور سے جھکورے دیئے تو ان کے آنسو نکل آئے اور وہ اسی طرح بہتے ہوئے گانے لگے۔ ”اک لڑ کے کو بہکایا تھا اور انہوں ساتھ لگایا تھا۔“ میں اس بد تمیزی کی تاب نہ لاسکا۔ ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر کے بالوں کو اس زور سے کھینچا کہ وہ کرسی سے اٹھ کر کبڑے کبڑے ہو گئے اور ان کی بُخی خود بخود معدوم ہو گئی۔

انہوں نے میری کلائیاں پکڑ کر ہاتھ چھڑواتے ہوئے کہا۔ ”آؤ!“ کچا سمجھن گزر کر ہم برآمدے سے ہوتے ہوئے بھوسے والی کو ٹھڑی کے پاس جا لٹکے۔ بھیانے لیپ دہلیز پر رکھ کر کواڑ کھولے۔ اندر سے گرم گرم بھوسے کا ایک بھبھکا

آیا اور باہر کی خنک فضاشیر گرم سی ہو گئی۔ بھیانے لا لشین اٹھا کر ہولے سے سیٹی بجائی اور دروازے کی اوٹ سے سفید رنگ کا ایک موٹا تازہ کٹا برآمد ہوا۔ اس کی آنکھیں کچوپ کی طرح چمک رہی تھیں اور اس کے کان اٹھا سی کا ہند سہ بنے کھڑے تھے۔ اس نے تیز تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور دم ہلانے لگا۔

میں سب کچھ بھول گیا اور بھیا کا بازو ہلاکر پوچھنے لگا۔ ”بھیا یہ گل ٹریا ہے؟“ بھیا نے محبت بھری نظر وہ سے مجھے دیکھا اور سر ہلاکر بولے۔ ”در اصل یہ نیل ٹری ہے۔“ مجھے ان کی یہ بات بالکل ناگوار نہ گزری اور میں مجھ کرنی ٹی کو دیکھنے لگا۔ اس کے گلے میں ریلوے بکنگ کی پرچی لٹک رہی تھی اور اس کی گردان اور چہرے سے بھوسے کے بہت سے نیلے چمٹے ہوئے تھے۔ میں نے بھیا کا ہاتھ پکڑ کر بڑے پیار سے بلا یا اور کہا۔ ”صح ہو گی تو ہم اسے سیر کرانے لے جائیں گے اور بیلے میں چھوڑ دیں گے۔ یہ ہمارے لیے خرگوش پکڑ کر لائے گا اور ہم ان سے کھیلا کریں گے۔“ بھیا اسی طرح کھڑے میری باتیں سنتے رہے۔ پھر انہوں نے لا لشین اٹھا کر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں صح ہو گی تو ضرور چلیں گے، اب اسے ٹونے دو۔“

بستر میں لیٹ کر میں جی جی میں پچا تومان کا شکریہ ادا کرنے لگا جنہوں نے وعدے کے مطابق کوہاٹ جاتے ہی ٹی ٹی بیچج دیا تھا۔ جب تک وہ ہمارے یہاں رہے، روزانہ ٹی ٹی کے قصے سناتے رہے۔ اس کی ماں کی اچانک موت کا تذکرہ کرتے رہے اور اس کے بھائیوں کی بیہودگیوں اور گستاخیوں پر روشنی ڈالتے رہے۔ ہم ان کے پیچھے پڑ گئے کہ ٹی ٹی ہمیں بھجواد تھے۔ ہم سب بھائی بہن باری باری سے اپنی ایک وقت کی روٹی اسے ڈالتے رہیں گے۔ پچا تومان گئے مگر اب ابھی نے اجازت نہ دی۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے گھر میں تو آدمیوں کو کوئی نہیں پوچھتا، کتنے کادھیاں کون رکھے گا؟ ہم سب رونے لگے، ہاتھ جوڑے، منتیں کیں اور انہیں یقین دلایا کہ اگر ٹی ٹی کو کبھی کوئی تکلیف ہوئی تو وہ ہمیں گھر سے نکال دیں۔ اب ابھی کا دل بچ گیا اور انہوں نے یہ شرط پیش کی کہ اگر بھیا اس کی غور و پرداخت کا ذمہ لیں تو البتہ وہ ٹی ٹی منگوانے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ بھیانے حامی بھرلی اور ہم اس وقت سے ہر گھری ٹی ٹی کا انتظار کرنے لگے۔

بھیا مجھ سے اتنے بڑے نہیں تھے۔ ہماری عمروں میں مشکل سے پانچ سال کا

فرق تھا لیکن چونکہ وہ ہم سب سے بڑے تھے، اس لیے میں اور میرے دونوں چھوٹے بھائی بہن انہیں بھیا کہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں برسر اقتدار سیاسی جماعت نے اقلیتی فرقتوں پر بڑے مظالم توڑنے شروع کر دیے تھے اور ان دراز دستیوں کی لپیٹ میں ملک کی قومی زبان بھی آگئی تھی۔ اردو کے حامیوں نے بلا لحاظ صوبہ و ریاست گھروں میں اردو بولنا شروع کر دی تھی اور یہ اسی سیاسی دباؤ کا اثر تھا کہ ہمارے گھر میں بڑے بھائی کو بھیا کہا جانے لگا۔ بھیا، ہم سب بہن بھائیوں سے مختلف تھے۔ دلبے پتلے زردی مائل سفیدرینگ کے بڑے خوش اطوار صاحبزادے تھے۔ بات بات میں لطیف پیدا کرتے۔ قدم قدم پر نئی شرارتیں سمجھاتے اور ہنسی ہنسی میں ہمیں پہنچاتے لیکن ان کے ارادے بُرے نہ تھے۔ خود ہی ہمیں بھس میں چنگاری ڈالنے کے طریق بتاتے اور آپ ہی اسے بھانے پر آمادہ ہو جاتے۔ اباجی سے پٹ پٹا کر ہم ان کی خوب مرمت کیا کرتے۔ وہ ہم سے خوب مار کھائے جاتے اور ہنستے رہتے۔ ہم نے کبھی انہیں منہ ٹھٹھائے یا روتے نہ دیکھا تھا۔ نحیف الجثہ ہونے کے باوجود بڑے عزم کے آدمی تھے۔ جس بات کا ارادہ کر لیا، اسے پورا کر کے چھوڑا لیکن ان سب خوبیوں کے ساتھ ان میں ایک کمزوری بھی تھی۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار اور محاط تھے۔ ان کی عقلمندی اور سمجھداری نے انہیں اباجی کا مشیر بنایا تھا اور اباجی ہر معاطلے میں ان کا مشورہ طلب کرتے رہتے۔ اس مرتبہ بھی اگر وہ حامی نہ بھرتے تو اباجی ٹیٹی منگوانے کی اجازت کبھی نہ دیتے۔

میں جی ہی جی میں پچھا امان کا شکریہ ادا کر رہا تھا اور بھیا دھونی ہوئی چمنی والی لاٹیں کے پاس پڑھنے میں مصروف تھے۔ کبھی کبھار وہ کتاب سے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھتے اور میں آنکھیں بند کر لیتا۔ پڑھنیس ٹیٹی کے بارے میں میں کب تک کیا کچھ سوچتا رہا کہ مجھے نیزد آگئی۔

اگلے دن صبح ہم دو دھ میں مسلی ہوئی روٹی کا کٹورا بھر کر ٹیٹی کے سامنے لے گئے اور اس کے نیبل میز ز کا نظارہ کرنے لگے۔ پل بھر میں اس نے کٹورا خالی کر دیا۔ اور کچھ اور ہے۔ ”جیسی نگاہوں سے ہمیں تکلنے لگا۔ ہم نے اتنا سارا مواد لا کر اسے ڈالا اور چشم زدن میں وہ بھی ختم کر دیا گیا۔ بھیانے اس کے جسم سے ایک ایک تنکا چننا اور اس کی پیٹھ پھپک کر بولے۔ ”اچھا بھی شام کو تمہاری اصل رہائش کا بندوبست کریں گے۔“ پھر

انہوں نے کٹور الٹھیا، غل کے نیچے جکڑ دھویا اور پھر لا کر نیٹ کے پاس رکھ دیا۔ اس دن ہم سب سکول ڈرادری سے پہنچے اور جب تک چھٹی نہ ہو گئی، اپنے اپنے ڈسکونٹ پر نشت کے انداز مدد لتے رہے۔ ہر ایک کے انہن میں نیٹ کی صورت گھوم رہی تھی۔ وہ لینا ہو گا اور اس کے چھپے ہوئے کامن ڈھپلے پڑے ہوں گے۔ وہ بیٹھا ہو گا اور زبان نکالے ہائپے جاتا ہو گا۔ وہ کھڑا ہو گا اور اس کی دم ادھر ادھر خجھوں رہی ہو گی۔ کسی نے بھی اپنا سبق دھیان سے نہ سن اور چھٹی ملتے ہی اپنے اپنے کروں سے سیدھے گھر کو بھاگے۔ بھیا وہاں پہلے سے بیٹھے تھے اور نیٹ کے نیچے بورہ بیس بچھار ہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ مل کر بوریاں ٹھیک کروانے لگا اور پہلی مرتب نیٹ کو تھیک کر دیکھا۔

شام کے وقت ہم نیٹ کو سیر کے لیے لے کر نکلے۔ بیلے میں جا کر ہم نے اسے کھلا چھوڑ دیا اور وہ جھاڑیوں میں ادھر ادھر سو ٹنگھ کر دیوانہ وار آگے پیچھے بچا گئے۔ بھیا زنجیر گھماتے، زور کی سیئی بجتے، اس کا نام لے کر پکارتے اور وہ ہمارے پاؤں میں آکر لوٹنے لگتا۔ تھوڑی دیر تک کنس کنس کر کے آواز نکالتا اور پھر بھاگ جاتا۔ میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ ”بھیا اگر یہ نم کو چھوڑ کر بھاگ گیا تو؟“

بھیا مسکرائے اور زمین پر زنجیر کی کندلی بٹھاتے ہوئے بولے ”مکا بڑا وفادار جانور ہے۔ اپنے مالک کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ نہیں جاتا اور اگر کوئی زبردستی لے جانا چاہے تو اس کو پھاڑ کھاتا ہے۔“

”اوہ اگر لے جانے والے کے پاس لاٹھی ہو تو؟“ میں نے پوچھا۔

بھیا نے کہا۔ ”لاٹھی چھوڑ بندوق ہو، پھر بھی یہ اس کے ساتھ نہ جائے گا۔ یہ تو بس جس کے گھر رہتا ہے، اسی سے پیار کرتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”سارے کتے آیے ہوتے ہیں کہ صرف ٹل ٹریا؟“

انہوں نے زنجیر سے کھلیتے ہوئے کہا۔ ”سارے!“

میراجی چاہا ساری دنیا کے کتوں کو گود میں اٹھا کر ان کا منہ ٹووم لون!

دوسرے روز عید تھی۔ رنگ برلنگے کپڑوں کے چاؤ میں اور عیدی کی کھنک میں دن بھر نیٹ کے پاس نہ چاہا۔ بازار میں کتاب اور پکوڑے کھاتا پھر اور دوستوں کے ساتھ ادھر ادھر گھومتا رہا۔ شام کے وقت جب میں گھر گیا تو بھیا نیٹ کو لے کر یہ

کے لیے نکل گئے تھے۔ تھوڑی دیر گھر بیٹھنے کے بعد میں پھر باہر نکل آیا۔ مجھے میٹھی گولیوں والی دکان یاد آگئی تھی جہاں سیپ کے بیٹوں جتنی پیسے کی تیس میٹھی گولیاں ملتی تھیں۔ دن بھر کی رقم میں سے صرف ایک آندہ باقی رہ گیا تھا اور میں تمام پونچی کا اکٹھا شاک خریدنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ قبے سے باہر چنگلی کے قریب صرف تیلورام کی دکان پر ایسی گولیاں ملتی تھیں۔ میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا اس کی دکان پر پہنچ گیا۔ اس کی دیگر گولیوں والی بوتل کی طرف اشارہ کیا اور خود سشوں پر بیٹھ گیا۔ ابھی اس نے ستر گولیاں ہی گئی تھیں کہ بھیائی ٹی کی زنجیر ہاتھ میں لٹکائے دکان پر آگئے۔ اس کے بال دھول میں آئے ہوئے تھے اور چہرے پر ہوا یاں اڑ رہی تھیں۔ انہوں نے میری کلاں پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ ”ٹی ٹی بھاگ گیا۔ میں نے بیلے میں لے جا کر زنجیر کھوی تو وہ ہوا ہو گیا۔“

میں سشوں سے بچلی کی سی تیزی سے اچھلا اور تیلورام کو گولیاں گنتے چھوڑ کر بیٹا کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ پہلے تو، تم تیز تیز قدم اٹھا کر چلے۔ پھر اچانک بھاگنے لگے۔ ہر راگیر سے ٹی ٹی کے بارے میں پوچھا۔ اس کا جواب سننا اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ بیلے میں پہنچ کر میں نے اور بھیانے زور زور سے آوازیں دیں، سیٹیاں بجا میں لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ہم نے بیلے کا کونہ کونہ چھان مارا مگر ٹی ٹی کا پتہ نہ چلا۔ میں اور بھیان تھک ہار کر بیلے کی اوپنی ڈھیری پر بیٹھ گئے اور میں نے ان کی طرف منہ کیے بغیر ہولے سے کہا۔ ”آپ نے اسے گھلا ہی کیوں چھوڑا؟“

بھیان نے بڑی سمجھدی گی سے کہا۔ ”کل بھی تو چھوڑا تھا، اس وقت تو نہ بھاگا۔

آج پتہ نہیں۔“

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”کل تو وہ نیا نیا آیا تھا، بیلے کا راستہ معلوم نہ تھا۔

بھاگتا کیسے؟“

بھیان نے کہا۔ ”وہ بھاگا نہیں، اسے کوئی پکڑ کر لے گیا ہے۔“

میں نے تنک کر کہا۔ ”کل تو آپ کہتے تھے کہ کسی اوز کے ساتھ جاتے نہیں اور کوئی لے جانے لگے تو اسے پھاڑ کھاتے ہیں۔“

بھیان نے کہا۔ ”ہاں، میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔ کوئی آدمی اس کا منہ باندھ کر

لے گیا ہے۔ جو نہیں کھو لے گا، ٹی ٹی اس کی گردن پکڑ لے گا۔“

میں نے ٹھنی آن ٹھنی کر کے کہا "آپ کیا لگتے ہیں اس کے۔ چچانے، ہم چھوٹوں کے لیے بھیجا تھا۔ آپ خواخواہ مالک بن کے بیٹھے گئے۔"

پھر میں بورنے لگا۔ "آپ کو تو ہم ہی اچھے نہیں لگتے، ہمارا کتا کیوں گلتا بھلا۔ آپ نے جان بوجھ کر اسے بھگا دیا ہے۔ آپ نے اپنے حصہ کی روٹی نہ دینے کے لیے اسے بھگایا ہے۔ آپ کے حصے کی۔ آپ کے۔ حصے کی روٹی۔ روٹی میں دے دیتا۔ میں۔" پھر میں سکیاں بھرنے لگا اور بھیانے مجھے اپنے ساتھ چھٹا لیا۔ میں نے ان سے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا "ہمارا کتا گنا کر ہم سے کیوں پیار کرتے ہیں آپ۔ جہاں ہماراٹی بھیجا ہے مجھے بھی وہیں بھیج دو۔ جس کے پاس اس کو بیچا ہے، مجھ کو بھی بھیج آؤ۔" پھر میں بھیا کی گرفت سے آزاد ہو کر ان کے پاؤں میں جھک گیا اور رورو کر کہنے لگا۔ "لوچا ہے جتنا مرضی مار لو، جتنا مرضی پیٹ لو۔ ٹی ٹی کو گنا کر جی خوش نہیں ہوا تو مجھے پیٹ کر خوش ہو جاؤ۔ لوچا ہے مجھے مار مار کر مار ہی ڈالو۔" میں ان کے پاؤں گھستا چلا گیا اور ایسے واہی بتاہی بکتا رہا۔ بھتیانے نہ تو میری کمر میں اپنا بازو ڈالا اور نہ میری ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر مجھے شہار اویا۔ جب میں نے سراخایا تو سامنے شیش میں اونچی ڈالیوں پر نگاہیں گاڑے بیٹھے تھے اور ان کی آنکھوں سے موتویوں ایسے شفاف آنسو ڈھلک پڑے۔

اگلے دن سے ٹی ٹی کی باقاعدہ تلاش شروع ہو گئی۔ صبح سکول پہنچتے ہی، ہم دونوں بھائی اپنے اپنے بستے ڈسک فیلوز کے سپرد کر دیتے اور ٹی ٹی کی تلاش میں نکل جاتے۔ بیلے کے ارد گرد تین تین چار چار میل کا رقبہ ہم نے انچ انج چھان مارا۔ ہر راہ چلتے، ہل چلاتے، اونٹ لادے جانے والے سے ٹی ٹی کی بابت پوچھتے مگر کوئی اثر آثار اس کا معلوم نہ ہوا۔ لاثین کے گرد بیٹھ کر ہم رات بھرا سی کا تذکرہ کرتے رہتے۔ اس کی صفات بیان کرتے سو جاتے اور اسی کا نام لے کر اٹھتے۔

بیلے کے ارد گرد تلاش کرنے کے بعد ہم نے گرد و نواح کے گاؤں کا دورہ کرنے کی ٹھانی۔ دوسرے پیر یہ میں بھیا امرت کا لیے کی باعث میکل لے آئے۔ مجھے کیریز پر بھایا اور خود چلانے لگے۔ کچھ کچھ سائیکل پر طے کیے۔ کچھ پیدل ندیاں نالے بڑی مشکل سے عبور کیے اور جب ہم پبلے گاؤں میں داخل ہوئے تو فارم کے

قریب ہمیں ایک نوجوان جاث ملا جسے ہم نے کئی مرتبہ قبے میں دیکھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ٹھنکا اور مسکرا کر پوچھنے لگا۔ ”شہری چڑیوں کی جوڑی ادھر کیے بھول پڑی؟“ بھیانے سائیکل سے سے اُتر کر کہا۔ ”ہمارا کتا گم ہو گیا ہے اور ہم اس کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”گل ٹریا تھا، کھڑے کانوں والا گل ٹریا۔ دو دن ہمارے پاس رہا۔ اس کے بعد میلے سے کوئی چرا کر لے گیا۔“

وہ شرارت سے مسکرا یا اور ہماری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میرے پاس تو کالا ڈبو ہے، وہ چاہو تو لے سکتے ہو۔“

بھیانے سہم گئے میں کچھ بولنے والا تھا کہ انہوں نے میری آستین پکڑ کر کھینچا اور گھبراہٹ میں گویا مجھے گھٹیتے ہوئے لے چلے۔

گاؤں کے اندر پہنچ کر ہم نے نمبردار کا گھر دریافت کیا۔ اس سے پوچھا تو اس نے تیکھی سے کہا۔ ”یہ وٹاں والی ہے کا نبھی ہوس نہیں اور اگر تم اس گاؤں کے لوگوں کو چور سمجھتے ہو تو جا کر پولیس میں رپٹ دے دو۔“ ہم اپنا سامنہ لے کر واپس آگئے لیکن ہمارے حوصلے نہ ٹوٹے اور ہم نے تلاش اسی طرح سے جاری رکھی۔ ہر گاؤں میں مختلف قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر ہم جی نہ چھوڑتے اور ہر گھر میں جھانک کر دیکھ لیتے۔ کئی مرتبہ ہمیں سائیکل نہ مل سکی تو ہم نے کئی کئی کوس کی مسافت پیدل طے کی۔ اگر بھیا کبھی ماہیوں ہو جاتے تو میں ان کا حوصلہ بڑھاتا اور کہتا۔ ”ایک مرتبہ پتہ چل جائے کہ ٹیٹی ہے کس کے پاس پھر چاہے وہ لاث صاحب کا بچہ ہو، یا اس ملک کا دا سرائے ہو، ہم اپنائی ٹیٹی نہ چھوڑیں گے لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔“

میں کہتا۔ ”بھیا آدمی نہ سکی۔ اس گاؤں کا ہی پتہ چل جائے جہاں ہمارائی ٹیٹی ہے، پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔“

بھیا میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے تو میں کہتا۔ ”اس گاؤں کو آگ لگا دوں گا۔ اپنی کلاس ساتھ لا کر فصلیں اجائز دوں گا۔ اس پر بھی انہوں نے ٹیٹی نہ دیا تو افضل کے ابا جی سے کہہ کر تھانے پکڑ دادوں گا۔“ اور بھیانے ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے

لگے۔ ”مشکل تو یہی ہے کہ اس کا پتہ نہیں چلتا۔“

ایک رات ہم ایسی ہی باتیں کر رہے تھے کہ بھیانے کہا۔ ”جس گاؤں میں ہم پہلے روز گئے تھے، میرا خیال ہے ٹیٹی ویس ہے۔“

میں چونکا ہو کر بیٹھ گیا اور بھیانے پوچھنے لگا۔ ”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ کیا آپ نے ٹیٹی کو وہاں دیکھا تھا؟“

”دیکھا تو نہیں تھا۔“ بھیانے کہا۔ ”مگر وہ آدمی جو گاؤں سے باہر نہیں فارم کے پاس ملا تھا، چور معلوم ہوتا تھا۔ تمہیں پتہ ہے، وہ ہمیں مذاق کر رہا تھا۔ میرا بھی کہتا ہے، اس نے ٹیٹی کو چھپا رکھا ہے اور شام کے وقت اسے سیر کرانے کے لیے باہر نکالتا ہے۔“ میں نے کہا ”ہاں وہ چور ہی لگتا تھا۔ چوری چھپانے کے لیے بار بار مسکرا تھا۔“ میرا بھی بھی کہتا ہے، ٹیٹی اس کے پاس ہے۔“

رات بھر ہم اسی قسم کی باتیں کرتے سو گئے اور اسی دن شام کو اباجی کی الماری سے پستول نکال کر پایادہ اس گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہم نے اپنے آپ کو فارم کے ایک محفوظ کونے میں چھپا لیا اور گاؤں سے آنے والے راستے پر اپنی نگاہیں جوادیں۔ لوگ آجارتے تھے لیکن ان میں وہ کالاڑبو نہیں تھا جس کی مسکراہٹ اس کے چور ہونے کی غمازی کرتی تھی۔ بڑی دیر تک ہم اسی طرح بیٹھے رہے۔ میں نے پستول بھیا کے ہاتھ سے لے لیا اور انہیں کہا کہ وہ باہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھتے رہیں، جو نبھی وہ آدمی ٹیٹی لے کر ادھر سے گزرے، مجھے ٹہوکا دے کر ہوشیار کر دیں۔ اس کے بعد میں جانوں اور میرا کام۔ گواں سے پہلے میں نے پستول کبھی نہ چلا�ا تھا اور نہ ایسا کرنے کی بہت ہوئی تھی مگر اس دن مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں صرف اسی کام کے لیے پیدا ہوا ہوں اور یہ کام صرف مجھی سے انجام کو چنچنے کے گا۔ ہم رات کو اس بذات چور کا انتظار کرتے رہے، پر وہ برآمد نہ ہوا۔ شاید اس کو ہمارے ارادے کا علم ہو گیا تھا اور وہ ہم سے ڈر نے لگا تھا۔

کتنی رات گزر جانے کے بعد ہم گھر پہنچے۔ پیچھی جان کو ہولے سے آواز دے کر دروازہ کھلوایا اور پستول واپس الماری میں رکھ کر اپنے اپنے بستریوں میں دپک گئے۔ ہر رات سکیمیں بناتے اور دن کے وقت ان پر عمل بھی ہوتا رہا مگر فٹی نہ ملنا تھا۔

ملا۔ آخر ایک رات ہم نے دور کعت نماز نفل ادا کر کے یہ دعا مانگی کہ اللہ میاں اگروہ زندہ ہے تو صبح تک آپ سے آپ ہمارے پاس پہنچ جائے اور اگر مر گیا ہے تو یہ سارا ثواب اس کی روح کو پہنچے۔ دعا کرنے کے بعد ہم اپنے اپنے سینوں پر پھونکیں مار کر سو گئے۔ کئی صبحیں آئیں اور گزر گئیں مگر فٹی نہ آیا۔ محلے میں دن رات بہت سے کتے بھوکتے رہے مگر کسی میں بھی فٹی کی کسی گھن گرج پیدا نہ ہو سکی۔

اور آج کئی سالوں کے بعد یہ سارا واقعہ میرے ذہن میں پھر تازہ ہو گیا ہے۔ اس وقت میں چھاپا کے گھر تیری منزل کی چھت پر بیٹھا ہوں اور نیچے پھولوں سے لدی پھندی ایک کار سرخ و بیز جھنڈیوں تلے کھڑی ہے۔ اس کے ارد گرد بہت سے نیچے زرق برق لباس پہنے اچھل کو درہ ہے ہیں۔ ڈوبتا ہوا سورج بروکیڈ کی اچکن میں سنہری کرمنیں بن رہا ہے اور اچکن والا بڑی بے صبری سے سکریٹ کے کش لگائے جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ جس چھت پر میں کھڑا ہوں، میں اس کے نیچے چھوٹے سے کمرے میں بھی اپنی بخوبی سی ٹالکیں میز پر رکھے کر سی پر دراز ہیں۔ ان کے باہم پاؤں پر نیچے کے نیچے مغلی پھوڑے کا ایک پرانا نشان ہے جو مسکراتے ہوئے نیچے کا چھوٹا سا چہرہ لگتا ہے۔ بھیا اپنے بالوں کو پہنل سے کرید رہے ہیں۔ ایک کتاب ان کی گود میں کھلی پڑی ہے اور وہ بھی میری طرح کھڑکی سے نیچے جھانک رہے ہیں جہاں پھولوں سے لدی پھندی کار کے پاس بروکیڈ کی اچکن پہنے ایک سیاہ قام نوجوان کھڑا ہے جو لڑکی اس کار میں سوار کرانے کے لیے لاٹی جا رہی ہے وھیا نے اس کے بارے میں کبھی کسی کو کچھ نہیں بتایا لیکن مجھے ان کی ڈائری کا ایک ورق یاد آ رہا ہے۔ ان کی الماری کھلی رہ گئی تھی۔ وہ اپنے طلبہ کو تاریخی عمارت کی سیر کرانے لے گئے تھے اور شام سے پہلے نہ لوٹ سکتے تھے۔ میں نے ان کی ڈائری نکال کر جلدی پڑھنا شروع کر دی۔ شکستہ انگریزی میں انہوں نے ایک ایک تاریخ میں کاپی کے متعدد صفحات سیاہ کر کے تھے۔ انہوں نے لکھا تھا۔ یہ دن بڑا سہانا ہے۔ یہم صبح کیرم کھلیتے رہے۔ ”ت“ مجھے اچھے اچھے لطیف سنا کر خوب ہنساتی رہی۔ پھر میں ”ایڈنیٹ“ کے مختلف اقتباسات اسے سنا تارہا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور میرے چھٹے کو میری انگلی میں گھمائے جاتی تھی۔ میں نے پڑھنا بند کر کے

کہا۔ ”زیور عورتوں کی جان ہوتا ہے۔ دیکھو تم کس محبت اور شوق سے چھلے کو گھما رہی ہو اور تمہیں شاید اس کا علم بھی نہیں کہ تم کیا کر رہی ہو۔“ اس نے برا مان کر ہاتھ روک لیا اور میری طرف منہ کر کے بولی۔ ”تم سمجھتے ہو، میں ہر انگلی کے چھلے کو اسی طرح گھماوں گی کیونکہ میں عورت ہوں اور عورت کو زیور عزیز ہوتا ہے۔“ میں نے ڈرتے ہوئے کہا ”ہاں“ ”ت“ نے کہا ”خیر ہم ایسے کنگال بھی نہیں۔ میں نے ایسے بہت سے چھلے دیکھے ہیں، لیکن انہیں اس طرح پھرانے کی تمنا کبھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔“ پھر وہ ذرا رک کر بولی۔ ”اگر اس انگلی میں گھاس کا چھلا بھی ہوتا تو بھی میں اسی شوق سے گھماتی۔“ آگے بھیانے لکھا تھا۔ ”آج مجھے یوں لگتا ہے جیسے کائنات کی سب سے معزز ہستی ہوں۔ جانداروں میں سب سے محترم ہوں۔ میرا جی اپنی عزت آپ کرنے کو چاہتا ہے اور مجھے چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ایسے لگتا ہے جیسے حضوری کے تمام آداب مجھ میں سمٹ آئے ہوں۔“ ”ت“ دوسرا لڑکوں سے کس قدر مختلف ہے۔ اسے دنیوی مال و متناع اور جاہ و جلال کا ذرا بھی تو پاس نہیں۔“

میں چھت پر سے نیچے جھانک رہا ہوں اور بھیا بھی کھڑکی میں سے اسی گروہ کا نظارہ کر رہے ہیں جس پر میری نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ ”ت“ سرخ رینگ کی مسالہ نگی اوڑھنی اوڑھنے عورتوں کے جلو میں کھڑی ہے۔ بر و کید کی اچکن والا پھولوں کی لڑیاں ایک طرف ہٹا کر کار کا دروازہ کھول رہا ہے اور گل ٹریا بڑے جاپ اور بڑی لہک کے ساتھ اندر داخل ہو رہی ہے۔ اس نے سر جھکا کر کار میں ایسے قدم رکھا جیسے وہ بھیا کو جانتی ہی نہیں۔ آج میرے پاس میرا اپنا پستول ہے لیکن وہ چل نہیں سکتا۔ اس وقت میری آنکھوں کے سامنے کالا ڈبو گل ٹریا کو لیے جاتا ہے اور میں اپنے پیارے بھیا کی مدد نہیں کر سکتا۔ وہ بھیا جو آج بھی ہم سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا بچپن میں کیا کرتے تھے۔ وہ جو کمرے میں میز پر ٹانگیں رکھے یہ سب دیکھ رہے ہیں اور جن کے سخنے کے نیچے مغلیٰ پھوڑے کا ایسا مسکراتا نشان ہے جسے خواخواہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ ابھی کار چلے گی اور بھیا کے پاس ایک ڈائری رہ جائے گی جیسے ٹیٹی کے گم ہو جانے پر ہمارے پاس زنجیر رہ گئی ہی۔

متنکہ

سلسلہ قاف کی ایک جھیل میں جہاں صنوبر کے بہت سے درخت ایستادہ ہیں اور جس کے کنارے گھنے بید کی شاخیں صدیوں سے سورج کو روکے کھڑی ہیں۔ ایک ڈونگا تیر تار ہتا ہے جس میں ایک جواں سال شہزادی بال کھولے لیٹی رہتی ہے۔ اس علاقے کے معتمد دیو مالانے اس شہزادی کی زندگی سے وقت کو خارج کر دیا ہے اور شہزادی کی عمر آج بھی اتنی ہی ہے جتنی آج سے کئی ہزار سال پہلے تھی۔ جب شہزادی کو اس گھور اندر ہیرے میں زندگی بسر کرتے کئی قرن گزر گئے تو اس نے بید کے جھنڈ میں چپھانا والی چڑیوں سے درخواست کی کہ وہ کہیں سے اسے روشنی کی ایک کرن لادیں لیکن چڑیاں اسی طرح چپھاتی رہیں۔ اس نے صنوبر کی شاخوں میں بسرا لینے والے پرندوں سے گڑ گڑا کر کہا کہ وہ روشنی کے پہاڑ سے اجیالے کی ایک ڈلی توڑ کر لادیں، پر اس کی گڑ گڑا ہٹ جھیل میں ڈوب کر رہ گئی۔ ان تاریک لمحوں میں ایک شام وہ روشنی کی تمنائیں سکیاں بھر رہی تھی تو پروانوں کا ایک گروہ ادھر آنکلا۔ شہزادی نے انہیں پکار کر اپنی طرف بلایا اور کراہتے ہوئے کہا۔ ”میں روشنی کی ایک کرن کے لیے ترس گئی ہوں اور میرے ساتھی میری مدد نہیں کرتے۔ تم میں سے جو کوئی مجھے روشنی لادے گا میں اس کے ساتھ شادی کر لوں گی۔“ یہ سنتے ہی پروانے دنیا کے چاروں کھونٹ پھیل گئے اور روشنی حاصل کرنے کے لیے شمعوں پر جل جل کر مرنے لگے۔ کئی سال گزر گئے۔ ان پروانوں کے بچے اور پھر ان کے بچے اور ان بچوں کے بچے شہزادی کا سو بُر جیتنے کی غرض سے دھڑا دھڑ جلتے رہے لیکن وہ اس ڈونگے کا کوئی کونہ منور نہ کر سکے۔ صدیاں گزر گئیں۔ زمانے بنتے اور بگزتے رہے اور پروانے اسی طرح جلتے رہے۔ ایک دن ایک

کا ہل جگنو اچانک اس وادی میں جانکلا اور اڑتا گھومتا بید کی شاخوں سے ہوتا ہوا اس جھیل کے کنارے پہنچ گیا۔ شہزادی خوشی سے چلا اٹھی۔ اس نے اپنی بانیں آگے پھیلا کر کہا۔ ”تم میرے لیے روشنی لے آئے، میرے پروانے!“ جگنو شہزادی کی بات سمجھے بغیر اس کی جھوپی میں گر گیا اور شہزادی کے چہرے پر روشنی کی لہریں منٹے ابھرنے لگیں۔ اس نے جگنو سے شادی کر لی اور پھر ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے لیکن اس شادی کی خبر پروانوں کو آج تک نہیں ملی۔ وہ اسی طرح جل رہے ہیں اور شعلوں پر جھپٹ رہے ہیں۔ آج بھی ہر پروانہ جو سر سے کفن لپیٹے شعلے کی طرف لپکتا ہے، یہی سمجھتا ہے کہ اس نے پھر اب اندر رکھا ہے اور وہ شہزادی کو بیانہ ہے جا رہا ہے۔

صوبیدار رنیتے خان کے لڑکے کو پڑھنے کی لٹ پڑھنی اور وہ پڑھتے پڑھتے بی۔ اے تک جا پہنچا۔ باپ کا خیال تھا کہ سپاہی زادہ دوسوں پاس کرنے کے بعد فوج میں لیفٹینٹ ہو جائے گا۔ گھر میں روپوں کی ریل پیل بھی ہو گی اور خاندان کی عزت کو بھی چار چاند لگ جائیں گے لیکن سپاہی زادہ صرف ریتے خاں کا لڑکا ہی نہ تھا، اس کی رگوں میں بصرے کے قبیلہ تاری کی لڑکی کا خون بھی شامل ہو گیا تھا اور اس کا وجود تکواروں کی جھنکار اور قرأت کے اتار چڑھاؤ کی، تم آہنگ سے استوار ہوا تھا۔

چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں تالاب کے کنارے صوبیدار کامکان تھا جس کا ایک کرہ سرور کے لیے مخصوص ہوتا۔ گاؤں میں ہوتا تو دن بھرا پئے کمرے میں بیٹھا کرتا ہیں پڑھتا اور جب باہر ہوتا تو یہ کرہ مقلعہ رہتا اور کسی کو ادھر جھانک کر دیکھنے کی جرأت بھی نہ ہوتی۔ بی۔ اے کا متحان دیئے اسے ایک ماہ گزر چکا تھا، لیکن مطالعے کا یہ عالم تھا گویا کل پہلا پرچہ ہو۔ سرور کو شاعری کا کچھ ایسا چکا کا پڑا تھا کہ دن بھر ہزاروں شعر پڑھنے کے بعد بھی سیری نہ ہوتی۔ مطالعے کے بعد اگر کسی چیز کا شوق تھا تو وہ شکار تھا۔ عمر خیام کے مصور ایڈیشن کا مطالعہ کرتے ہوئے جب وہ کسی رباعی پر پھر ک اٹھتا تو اس کی زنگاہ دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی ڈبل بیرل پر جا پڑتی اور وہ مسکرا کر کہتا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ میں فردوس مکانی مجی الدین اور نگزیب عالمگیر کے زمانے میں پیدا نہیں ہوا جو شعرو شکار کو کا ر بیکار ان تصور کرتے تھے بلکہ ایسے زمانے میں آنکھ کھولی ہے جس کے لوگ علم و ادب کے مقابلے میں دنیا کی ہر چیز کو یقین سمجھتے ہیں۔“ اور واقعی سرور بہت خوش

قسم نوجوان تھا کیونکہ وہ اس دور کی پیدائش اور تھا جس میں صرف پڑھے لکھے لوگ ہی جہا نگیری اور جہان بانی کر سکتے ہیں۔ جہاں تجھے ہزاروی، دس ہزاروی، جیسے اور کل غنی لگانے والے اور تخت طاؤس پر بیٹھنے والے سر نیبوزا کر چلتے ہیں کیونکہ یہ دور سلطانی جمہور کا دور ہوتا ہے۔

بڑے پیرزادہ صاحب نے ایک دن سرور کو بلا بھیجا اور اپنے ساتھ پلٹگ پر بٹھا کر چائے پلاٹی۔ یہ اس گاؤں کے بالک بھی تھے اور پیر بھی۔ ان کے نام کا سکمہ دوڑو در چلتا تھا اور ان کے تعویز سمندر پار تک جاتے تھے۔ انہوں نے بڑے پیار سے سرور کے کندھے پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ”تو اپنے گاؤں کا بیٹا ہے اور اس علاقے میں ایک ہی پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ میں تجھ سے اور تیرے باپ سے خوش ہوں۔ تو جانتا ہے میرے مرحوم بھائی اور بھاوج کی ایک نشانی میری بھتیجی لاہور میں پڑھتی ہے۔ اس مرتبہ اس کے امتحان کی رپورٹ کچھ تسلی بخش نہیں۔ تو ان دونوں فارغ تو ہے ہی، اگر دو گھنٹے اسے پڑھا دیا کرے تو میں تیرے حق میں دعا کروں اور تیرے باپ کو فوجی خدمات کے صلے میں ایک آدھ مریع بھی دلوادوں۔“ جب انہوں نے سرور کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے اپنا بدن ذرا سماچر لایا اور جب انہوں نے یہ بات کہی تو وہ کسمایا لیکن انکار کرتے وقت وہ گھبرا گیا اور اس نے حامی بھرلی۔

تیسری منزل کے چوبارے میں جب وہ آنسوں کی کرسی پر بیٹھا دانتوں سے ناخن کتر رہا تھا تو پر دے کی اوٹ سے ایک ہاتھ برآمد ہوا۔ سرور نے اپنا کام چھوڑ کر کتاب پکڑ لی اور اسے گود میں ڈال کر یہ سوچنے لگا کہ اب بات کیسے شروع کرے۔ کتاب کے کونے پر لکھا تھا۔ عطیہ بانو پیرزادی، رول نمبر 132 یکینڈ ایئر۔ جب سرور کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی تو اس نے ہولے سے کھنکا کر کہا۔

”آپ کا روپ نمبر ایک سو بتیس ہے؟“
”بھی ہاں۔“

اور بڑی دور جیسے قاہرہ روئی یو شیشن سے ام کلثوم نے عربی نغمے کا پہلا بول ادا کیا ہوا۔

سرور کو جب اپنے بے بودہ سوال کا احساس ہوا تو اس نے کہا۔ ”رابن ہڈائیڈ۔

ایلین اڈیل میں شاعر نے ایک مشہور قصے کو نظم کر دیا ہے اور اس بات —
عطیہ نے بات کاٹ کر پوچھا۔ ”جی یہ رابن ہڈوا قی کوئی آدمی تھا یا یو نہیں قصہ
ہے؟“

”تھا کیوں نہیں۔ واقعی ایک آدمی تھا۔ بڑا بہادر آدمی۔“ سرور نے
پروفیسروں کا طریق اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”جیسے ہمارے یہاں راجہ رسالو تھا—
راجہ رسالو کو جانتی ہیں آپ؟ وہی جس کا غار مشہور ہے۔“ عطیہ نے ہولے سے ہنس
کر کہا۔ ”جی جانتی تو نہیں لیکن اس کے بارے میں نہ ضرور ہے۔ جی اس کے پاس
ایک تیر کمان بھی تھی۔“

”ہاں وہی۔“ سرور نے سر کھبا کر کہا۔ ”آپ کے پاس کاپی ہو تو آپ ساتھ
ساتھ معنی بھی لکھتے جائیں۔“

چوبارہ تیسرا منزل پر تھا۔ بلی بھی سیڑھیاں چڑھتی تو آہٹ ہوتی، پتہ بھی
کھڑکتا تو پتہ چل جاتا۔ اس لیے پرده آہستہ آہستہ سرکنے لگا۔ جب عطیہ معنی لکھ رہی ہوتی
تو سرور چور نگاہوں سے اسے دیکھ لیتا۔ جب سرور نظم پڑھنے میں مصروف ہوتا تو عطیہ
نکھلوں سے ادھر دیکھ لیتی اور پھر اپنی کاپی پر جھک جاتی۔

اور جب دنوں کی کتنی ساری پتلی پتلی رسیاں بل کھا کھا کر مہینے کا موٹارستہ بن
گئیں تو عطیہ اور سرور نٹوں کی طرح اچک کر اس رستے پر چڑھ گئے اور ایک دوسرے کا
ہاتھ پکڑ کر کاپنے لگے۔

عطیہ نے منہ چھلا کر کہا۔ ”میں آپ سے نہیں بولتی۔ پرسوں آپ ہریال
شکار کر کے لائے اور ہمارے گھر گوشت کی ایک بوٹی تک نہ بھیجی۔ میں میں آپ سے
نہیں پڑھتی۔“

سرور کھسیانا ہو گیا اور نگاہیں نیچی کر کے بولا۔ ”مجھے بڑے آدمیوں سے بڑا ذر
لگتا ہے۔ بڑے پیرزادہ صاحب مجھ سے ناراض ہون جاتے کہ ایک سپاہی زادے نے
ہمارے گھر میں گوشت کیوں بھیجا تو میں کیا کرتا؟“

”ناراض ہو جاتے تو ہم ان کو راضی کر لیتے۔“ عطیہ نے آنکھیں نچا کر
کہا۔ ”انہیں منانا کون سی بڑی بات ہے۔ لیکن میں تو آپ سے بولتی ہی نہیں۔“

”لیکن میں تو۔ میں نے تو“ اور سرور کو کوئی بات نہ سوچی اور اس نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے معاف کرو۔“

جب عطیہ نے اسے معاف کر دیا تو وہ بہت خوش ہوا اور اپنی بندوق کی تعریفیں کرنے لگا اور اس کے کندے کو سراہنے لگا جہاں اس کا رخسار ٹھیک بیٹھتا تھا اور نشانہ خطا نہیں ہوتا تھا۔

عطیہ نے یوں ہی خوفزدہ ہو کر کہا۔ ”ہائے بندوق چلاتے ہوئے تو بڑا دھکا لگتا ہے۔“

”دھکا!“ سرور نے حیران ہو کر کہا۔ ”ہاں پہلے پہلے ذرا محسوس ہوتا ہے، اس کے بعد توعادت ہو جاتی ہے۔“

عطیہ نے پوچھا۔ ”یہ بندوق چلانا بڑی مصیبت ہے نا؟ جب ایک کارتوں جل جاتا ہو گا تو کتنی خوشی ہوتی ہو گی کہ چلو ایک توکم ہوا۔“

”ہوں!“ سرور نے ذرا چونک کر کہا۔ ”ہاں۔۔۔ لیکن۔۔۔ بس ایسا ہی ہے۔“

درachi اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ کوئی شاعروں کی سی بات کرے کہ بندوق سے زیادہ تمہارے ابریشمی بال مصیبت ہیں۔ یا کارتوں سے زیادہ تمہاری آنکھیں خطرناک ہیں۔۔۔ لیکن یہ تشبیہیں کچھ مناسب نہ تھیں اور وہ سوچتا ہی رہ گیا۔

آرام کر سی میں لیٹ کر جب وہ سوچ میں ڈوب جاتا اور عطیہ ہولے سے اس کا لندھا لہا کر کہتی۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“ تو اس کا جی جواب دینے کو نہ چاہتا اور وہ ایک بار پھٹے جھپٹ کر مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا۔ ”کچھ بھی نہیں۔“ ”کچھ تو ہے۔“ عطیہ پوچھتی۔

”چج کچھ بھی نہیں۔“ وہ ایک بار پھر اسی طرح مسکراتا اور عطیہ روٹھ جاتی۔ سرور عطیہ کے دامیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو ایک ہاتھ میں اور دو کو دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر کہتا۔ ”میں بھی تمہارے ایسا امیر ہوتا تو کتنی اچھی بات تھی۔“

اور عطیہ اپنے ہاتھ چھڑا کر پوچھتی۔ ”بس یہی بات سوچ رہے تھے۔“ ”ہاں۔“

”تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے ایسی باتیں نہ سوچا کرو۔“
”کیوں؟“

عطیہ پہلے ذرا مسکراتی، پھر تسلی آمیز لبجے میں کہتی۔ ”اللہ میاں نے ہر شخص کی قسمت ایک تھی پر پہلے سے لکھ رکھی ہے اور اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتی، جو کچھ ہوتا ہے، اس لوحِ حفظ کے مطابق ہوتا ہے اور۔“

سرور بات کاٹ کر کہتا۔ ”اور میری لوحِ حفظ پر غربی لکھی ہے۔“

”ہاں۔“ عطیہ درد بھرے لبجے میں کہتی۔ ”خدا جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔“ پھر وہ کرسی کے بازو پر بیٹھ جاتی اور سرور کے کندھے پر باتھ رکھ کر کہتی۔ ”تم دل میلانہ کرو اور ایسی باتیں نہ سوچا کرو۔“
لیکن ایسی باتیں نہ سوچ کر بھی سرور کا دل میلا ہی رہتا۔

سارا گاؤں پیرزادہ صاحب کی اس لیے عزت کرتا تھا کہ وہ گاؤں کے مالک تھے۔ ان کی بے شمار زمینیں تھیں، ان گنت مزارے تھے، سینکڑوں مویشی تھے اور پیشیوں کے علاوہ بینکوں میں کتنا بھی روپیہ تھا اور وہ وقت بے وقت لوگوں کو قرض دیتا تھا اور لوگ سرکار کو اس لیے مان دیتے تھے کہ سرکار کے خزانے بھی روپے سے بھرے ہوئے تھے اور اس کی جاگیریں بہت وسیع تھیں اور ان پر سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا، لیکن لوگ ریتے خان کی عزت نہ کرتے تھے۔ حالانکہ اس کے پاس ملٹی کراس باقاعدہ نماز پڑھتا تھا۔ روزے رکھتا تھا اور اپنی حسیثیت کے مطابق خیرات بھی کرتا تھا لیکن لوگ نہ تو چکر کاٹ کر اسے سلام کرنے آتے تھے اور نہ اس کی آمد پر کھڑے ہوتے تھے۔ سرور جانتا تھا کہ چونکہ نیا لوگ جاہل ہیں، اس لیے انہیں آدمی کی پرکھ نہیں ہے۔ اس کا ایمان تھا کہ خدا جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ خدا نے دیو جانس کلبی کو عزت دی تھی اور سکندر پایادہ اس کے حضور میں آیا تھا اور دیو جانس کلبی اس لیے معزز تھا کہ سکندر کو آدمیوں کی پرکھ تھی لیکن سرور کے گاؤں والے آن پڑھ تھے اور وہ ریتے خان کی عزت نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ خدا نے اسے عزت دے رکھی تھی۔